باب۔۱۶

ترجمہ

فص سلیمانیہ

حکمت رحمانیہ

[(سورۃ النمل کی آیات ۲۹، ۳۰اور ۳۱میں ہے)،(قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ] إِنِّي أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ۔إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّـهِ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ ۔أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي،(یعنی){بلقیس} کہتی ہیں میرے پاس ایک بزرگ (یعنی لائقِ احترام) خط ڈالا گیا، پہنچایا گیا ہے۔ اور وہ خط سلیمانؑ کی طرف سے ہے، ان کا بھیجا ہوا ہے اور اس کا مضمون یہ ہے "اللہ کے نام سے جو عام طور سے وہی رحم کرتا ہے اور خاص طور سے بھی وہی رحم کرتا ہے۔ مجھ پر غلبہ جوئی نہ کرو اور میرے پاس آؤ اطاعت کرتے"۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کے خط کی ابتدا۔إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ سے ہے۔ شیخؒ کہتے ہیں (کہ) یہ درست نہیں۔ لوگوں نے اپنی بات بنانے کے لیے نامناسب توجیہیں کیں، جو سلیمانؑ کی معرفت اپنے رب کے متعلق تھی، اس کے بالکل خلاف ہے۔ ان مفسرین کا قول کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ اس صورت میں اسم سلیمانؑ کی تقدیم اسم اللہ پر لازم آتی ہے اور شانِ سلیمانؑ کے لائق ہو سکتا ہے۔ جب کہ بلقیس جو ہنوز اسلام نہیں لائی تھیں، کہتی ہیں (کہ) میرے پاس ایک بزرگ خط آیا ہے، یعنی وہ خط بلقیس کے پاس بھی واجب التعظیم تھا۔

ان مفسرین کو نام سلیمان سے خط کی ابتدا سمجھنے کی وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ عموماً مرسل بادشاہ (یعنی خط لکھنے والے شاہ) کے نام سے ابتدا کی جاتی ہے، تو دوسرا بادشاہ اس کا احترام کرتا ہے۔ چوں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نام سے ابتدا نہیں کی (تھی) لہٰذا نامۂ مبارک کو کسریٰ نے چاک کر دیا، (پھاڑ دیا)۔ شیخؒ کہتے ہیں، یہ سب بے کار تاویلات ہیں۔ کسریٰ نے تو حضورؐ کا پورا نامہ پڑھ کر، اس کا پورا مضمون سمجھ کر نامۂ مبارک کو چاک کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بلقیس کو جو توفیقِ خیر دی تھی (وہ) اگر نہ دی ہوتی تو وہ بھی وہی بے ادبی کرتی جو کسریٰ نے خط جلانے سے کی تھی۔ صاحبِ خط کا نام، نام خدا کے پہلے رکھنے سے کچھ فائدہ ہوتا، نہ پیچھے۔

سلیمانؑ نے، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم، میں رحمٰن ورحیم دو اسم لکھ کر رحمٰن سے رحمتِ امتنانی اور رحیم سے رحمتِ وجوبی کو بیان کیا۔ رحمتِ امتنانی (یعنی) ابتدائی رحمت، غیر جزاے عمل۔ رحمتِ وجوبی (یعنی) جزاے عمل۔ رحمٰن نے بلا سبب، بلاوجہِ عمل یہ احسان کیا کہ پہلے فیضِ اقدس سے حقائقِ اشیا (اور) اعیان ثابتہ، مخلوقات کو علم میں نمایاں کیا۔ پھر فیضِ مقدس سے خارج میں موجود کیا۔ اور رحیم نے رحمتِ رحمٰن سے ہر ایک کو اس کے حسبِ استعداد حصّہ دلایا۔ یہ رحمتِ وجوبی بھی ایک طرح سے امتنانی ہی ہے۔ کیوں کہ جزاے عمل کو خود پر واجب کر لینا یہ بھی اُس کا امتنان و احسان ہے۔ پس رحیم، رحمٰن میں داخل ہے، جیسے عام میں خاص داخل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ۔[(یعنی) اس نے اپنے آپ پر رحم و کرم کو واجب کر لیا، (الانعام:۱۲)]، اللہ سبحانہٗ نے خود پر رحمتِ وجوبی یعنی جزاے عمل کو لازم کر لیا ہے۔ یہ اس لیے کہ بندہ حسبِ حکم خداوندی نیک اعمال کرے تو اس کا حق بھی اللہ تعالیٰ پر پیدا ہو جائے اور اس رحمت کا یعنی رحمتِ وجوبی کا وہ مستحق ٹھیرے۔ مگر اس حق کو حق تعالیٰ پر کس نے واجب کیا۔۔؟ خود خداے تعالیٰ نے۔۔۔ کسی اور نے واجب نہیں کیا۔۔۔ جب بندہ نیک اعمال اور اس قرب کو پہنچ جاتا ہے تو اس کو منکشف ہو جاتا ہے (کہ) اس کے توسط سے کرنے والا کون ہے۔

عمل، انسان کے ہشت اعضا (یعنی آٹھ اعضاے جسمانی) پر منقسم ہے۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، سماعت، بصارت، زبان، اور پیشانی۔۔۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعضا کی حقیقت (وہ) خود ہے۔ لہٰذا اصل عمل کرنے والا تو خود خداے تعالیٰ ہے، نہ (کہ) کوئی اور۔ ہاں صورت تو بندے کی ہے۔ اسماے الٰہیہ، مخلوقات میں مندرج و داخل ہیں۔ حق تعالیٰ مخلوقات کا جو ظاہر میں عین ہے، اصل ہے جب ظہور کرتا ہے تو اس کے مظہر کا نام "خلق" ہو جاتا ہے۔ اسی ظہور کی وجہ سے بندے پر اسم الظاھر (اور) الآخر صادق آتا ہے۔ اور اس لحاظ سے بندہ پہلے نہ تھا، پھر ہوا ہے۔ بندے کا ظہور، حق تعالیٰ پر موقوف ہے اور بندے کے اعمال اُس کی وجہ سے صادر ہوئے ہیں۔ حق تعالیٰ کا اسم الباطن اور الاوّل ہے۔ جب تم خلق کو دیکھو، اس پر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ کون کس اعتبار سے اوّل ہے، آخر ہے، ظاہر ہے (اور) باطن ہے۔

اسماے الٰہی کی معرفت اور ان کی نسبت سے عالم میں تصرف نصیب ہوتا ہے۔ پس یہ معرفت سلیمانؑ کو بھی حاصل تھی بلکہ سلیمانؑ نے دعا کی تھی، رَبِّ اغْفِرْ لِي وَ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي، (یعنی) میرے پروردگار (مجھے معاف کر دے اور) مجھے ایسی بادشاہی عطا کر کہ میرے بعد پھر کسی کو حاصل نہ ہو، (ص:۳۵)۔ وہ بادشاہی وہ ملک، اصل میں یہی معرفتِ اسماے الٰہی ہے۔ کیا ایسی حکومت کسی کو سلیمانؑ کے سوا ملی ہے؟۔۔۔ نہیں۔

قطبِ وقت (اور) غوثِ زمانہ تو تمام عالم کا شہنشاہ اور حاکم علی الاطلاق ہوتا ہے۔ بے شک قطبِ زمانہ حاکم علی الاطلاق (یعنی سب پر حکمران) ہوتا ہے۔ اُسی میں تجلیِ اعظم رہتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی "ملک" سے مراد، ظاہری و عالم شہادت کی حکومت اور تصرفِ عام ہے۔ دیکھو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ آپ کی باطنی حکومت اس سے زیادہ ہی تھی، مگر آپ نے عالم شہادت میں اس کو ظاہر نہیں کیا۔

ایک عفریت (یعنی ایک جِن) رات کے وقت حضور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ آپ پر حملہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عفریت پر حضورؐ کو پورا قابو عطا کیا۔ آپ نے ارادہ فرمایا کہ اس کو پکڑ کر مسجد کے ستون سے باندھ دیں، تاکہ صبح ہو تو مدینے کے بچے اس سے کھیلیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے دل میں دعاے سلیمانؑ کا خیال ڈالا اور آپ نے ظاہری تصرف عفریت پر نہ کیا۔ اور خدا نے اس عفریت کو ذلیل و خوار کر کے بھگا دیا۔ دیکھو! سرورؐ کائنات نے اپنے بھائی سلیمانؑ کی خاطر ظاہری تصرف سے عالم شہادت کی حکومت جن و انس پر نہیں کی، جیسے حضرت سلیمانؑ نے حکومت کی تھی۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنی دعا میں ملکا کہا الملک نہیں کہا۔ ملکًا، نکرہ لانے سے عام ملک ظاہری نہیں بلکہ ایک خاص حصۂ ملک مراد ہے۔ بہر حال دعاے سلیمانی سے عام حکومت مراد نہیں بلکہ خاص طور کی حکومت ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ان کو دیے ہوئے ملک کے اجزا میں دوسروں کی بھی شرکت تھی کیوں کہ وہ شہنشاہ تھے۔ ان کے ماتحت دوسرے شاہ بھی تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حکومتِ سلیمانی اس ملک پر بحیثیت مجموعی تھی۔

حدیثِ عفریت (یعنی جِن سے متعلقہ روایت) سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومتِ سلیمانؑ سے ظاہری تصرف مراد تھا، اور تصرفِ ظاہری خاصّۂ سلیمانؑ ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصۂ عفریت میں فامکنتی اللہ منہ، {یعنی} اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی، نہ فرماتے تو ہم سمجھتے کہ جب آپؐ نے عفریت کو گرفتار کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے دعاے سلیمانی کو یاد دلا دیا، تاکہ جان لیں (کہ) حضورؐ کو اس کی گرفتاری پر قدرت نہ ہوگی اور حق تعالیٰ نے ناکام و نامراد پلٹا دیا، بلکہ آپؐ نے فرمایا اللہ نے مجھے اُس پر قدرت دی۔ اس سے ہم سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس عفریت پر قدرتِ تصرف عطا کی تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دعاے سلیمانی یاد دلا دی اور آپؐ نے اس کا لحاظ رکھا اور سلیمانؑ کی خاطر رعایت کی۔ غرض یہ کہ اس سے ہم کو معلوم ہوا کہ سلیمانؑ کے بعد جو حکومت کسی کو نصیب نہ ہوئی وہ عام طور سے دنیا پر ظاہری حکومت ہے۔ ورنہ باطنی حکومت تو رسول مقبول ﷺ کو یقیناً تھی۔ بلکہ ہر زمانے میں قطبِ وقت اور غوثِ زمانہ کو رہتی ہی ہے۔

ہماری غرض اس مسئلے سے صرف یہی ہے کہ دو قسم کی رحمتوں کے متعلق کلام و تنبیہ کریں۔ جن کو سلیمان علیہ السلام نے دو اسم الٰہی کے ضمن میں بیان کیا ہے جس کا ترجمہ عربی زبان میں الرحمٰن، الرحیم ہے۔

رحمتِ وجوبی کو جس کا اقتضا، جزاے عمل ہے مقید و خاص کیا جیسے ،بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ،(یعنی) مومنین پر رافت و رحمت کرنے والا ہے،(التوبۃ:۱۲۸)۔ اور فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ،(یعنی) قریب میں میں اپنی رحمت واجب کروں گا متقیوں کے لیے،(الاعراف:۱۵۶)۔ اس رحمت کے مستحق صرف ایمان دار و متقی ہیں اور رحمتِ امتنان کو جو کسی عمل کے مقابل نہیں عام کیا۔ فرماتا ہے ،رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ،(یعنی) میری رحمت سب کو عام ہے، (الاعراف:۱۵۶)۔ یہاں تک کہ اسماے الٰہیہ پر بھی اس رحمت کا فیض پہنچتا ہے، یعنی حقائق و نِسَب۔ بات یہ ہے کہ صفت، غیر مستقل معنیٰ کو کہتے ہیں اور ذات، مرجعِ صفت کو۔ اور ذات و صفت کے مجموعے کو اسم کہتے ہیں۔ چوں کہ ذاتِ حقہ پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا اس لیے یہاں اسم سے مراد نسبت صفت بذات ہے۔ نہ ذات، نہ مجموعۂ ذات و صفات۔ ہم مظاہر ہیں اسماے الٰہیہ کے۔ اللہ تعالی نے ہم کو پیدا فرما کر اسماے الٰہیہ اور نسبت ہاے ربّانی پر رحمتِ امتنانی فرمایا، کہ ہم پر جو مظاہر ہیں اسماے الٰہیہ اپنے کمالات کا پرتو ڈالتے ہیں اور اپنے فیوض سے مستفیض کرتے ہیں۔ پھر جب ہم اپنے حقائق کو جانتے اور حق بندگی ادا کرتے اور اطاعت اختیار کرتے ہیں تو حق تعالیٰ اپنے پر رحمتِ وجوبی واجب کر لیتا ہے اور اجزاے اعمال عطا فرماتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ بھی ہم کو بتادیا کہ ہماری اصل حقیقت خود وہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس نے رحمتِ وجوبی کی بھی ہے تو خود اپنے پر۔ پس رحمت اس سے جدا ہی کب ہوئی اور کسی پر کب احسان و امتنان کیا۔ اور اُس کے سوا ہے ہی کون۔۔۔!

ہر چند کہ اصل الاصول اور حقیقت الحقائق جل جلالہٗ ہے مگر اس اعتبار میں احدیت و اجمال ہے۔ مگر اس کے ساتھ بیان مراتبِ رحمت اور احکام تفاوتِ درجات بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ خلق کا باہم تفاضل علوم و کمالات میں ظاہر ہے۔ دیکھو! بعض، بعض سے زیادہ عالم ہوتے ہیں۔ یہ کیا ہے۔؟ ان کے حقائق و استعدادات کا تفاوت ہے۔ بعض کی استعداد قوی ہے، بعض کی ضعیف (اور) بعض کے ظہور و خفا میں فرق ہے۔ بعض اعتدالِ حقیقی، روحانی و جسمانی سے قریب ہیں، بعض بعید۔ حالاں کہ ذاتِ الٰہی جو منبع ہے، ایک ہی ہے۔۔۔ مخلوقات کا تفاضل ایک طرف رہا، ذرا اسما و صفات الٰہیہ پر غور کرو۔ وہ بھی تو باہم مختلف درجات پر ہیں۔ دیکھو! ارادے کے مرتبے سے علم کا مرتبہ بڑا ہے۔ کیوں کہ علم کا تعلق شئے سے قوی تر اور ارادے پر حاکم ہے۔ اور ارادہ حاکم ہے قدرت پر۔ دیکھو! جب تک علم، ارادے کو متعین نہ کرے وہ کسی شئے سے متعلق نہیں ہوتا۔ اور جب تک ارادہ، قدرت کو خاص نہیں کرتا اور قدرت بالتعیین (یعنی تفصیل کے ساتھ) حکم نہیں کرتی، قدرت شئے سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ مگر قدرت کی حکومت ارادے پر نہیں (اور) نہ (ہی) ارادے کی حکومت علم پر ہے۔ قدرت کو ارادہ لازم ہے۔ ارادے کو علم لازم ہے نہ کہ بالعکس۔ یہ صفات الٰہیہ میں تفاضل ہے۔ اور تعلق قدرت پر ارادے کا کمالِ تعلق، اور اس کی فضیلت و زیادت ہے۔

اسی طرح سمع و بصر الٰہی اور تمام اسمائے الٰہیہ بعض سے بعض افضل ہونے میں مختلف مراتب اور متفاوت (یا فرق رکھنے والے) درجات پر ہیں۔ اسی طرح وہ صفات جو مخلوقات میں سے ظاہر ہو رہے ہیں، ظاہر میں متفاوت ہیں۔ دیکھو! کہتے ہیں، "یہ اُس سے زیادہ عالم ہے"، باوجود یہ کہ ذات ایک ہے۔ جس طرح اگر کسی بھی اسم الٰہی کو پیش نظر رکھو، اس کو بیان کرو تو تمام اسما آجاتے ہیں۔ ایک صفت کا بیان کرنا گویا تمام صفات کا بیان کرنا ہے۔ کیوں کہ صفت کے ساتھ ذات لگی ہوئی ہے، اور ذات کے ساتھ اس کے تمام اوصاف لگے ہوئے ہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ ایک صفت مقدم اور غالب رہتی ہے۔ اسی طرح مخلوقات جس میں اسمائے الٰہیہ کا ظہور ہے ان میں بھی ایک دوسرے کے کمالات کی قابلیت ہے۔ لہٰذا عالم کا ہر جزو مجموعۂ عالم ہے یعنی وہ تمام متفرقات عالم اور حقائق کا قابل ہے۔ اس لیے کہتے ہیں، الکلّ فی الکلّ، (یعنی) سب میں سب کچھ ہے۔ لہٰذا اس کہنے میں کہ زید، عمرو سے کم ہے، باوجود یہ کہ ذاتِ حق اصل و عین زید و عمرو ہے۔ اور ہویتِ حق ہی عمرو میں بہ نسبت زید کے کامل تر و عالم تر ہے۔ جیسے خود اسمائے الٰہیہ باہم متفاضل ہیں، حالاں کہ غیر حق نہیں ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق مخلوقات سے بہ نسبت مرید و قدیر کے عام تر ہے، حالاں کہ عالم ہی مرید ہے (اور) مرید ہی قدیر ہے۔ کوئی کسی کا غیر نہیں کیوں کہ ذاتِ حق ایک ہی ہے۔

میرے دوست! ایسا نہ کرنا کہ کہیں تم اس کو جانو (اور) کہیں نہ جانو۔ کہیں (تو) ثابت کرو (اور) کہیں سے نفی کرو۔ ثابت کرو تو اس طرح جیسا کہ اُس نے اپنے لیے ثابت کیا، اور نفی کرو تو اس طرح جس طرح اُس نے خود سے نفی کی۔ ذرا غور کرو اس آیت پر جو حق تعالیٰ کے حق میں جامع نفی و اثبات ہے۔ وہ (سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۱ میں) فرماتا ہے، لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ، (یعنی) اس کے جیسا کوئی نہیں۔ اس میں نفی ہے۔ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ، (یعنی) وہی سنتا ہے، وہی دیکھتا ہے۔ دیکھو! حق تعالیٰ نے صفت سماعت و بصارت بیان کی، جو ہر زندہ سننے والے اور دیکھنے والے کو عام ہے۔

یاد رکھو کہ ہر شئے زندہ ہے مگر ہر شئے کی زندگی اور حیات کا علم اس دنیا میں بعض کو ہے (اور) بعض کو نہیں ہے۔ کل آخرت میں سب کو معلوم ہو جائے گا کیوں کہ وہ دار الحیوان (اور) دار الحیات ہے۔ ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے۔ جھاڑ پہاڑ گواہی دیں گے۔ دنیا بھی حقیقت میں دار حیات میں ہی ہے مگر اس کا علم بعض سے مستور و مخفی ہے۔ تاکہ بندگانِ خدا کی بعض کی بعض پر فضیلت و خصوصیت باعتبار ادراک حقائق عالم کے ظاہر ہو جائے۔ جس کا ادراک عام تر ہو گا اس کو حق کا علم عام تر ہو گا۔ کیوں کہ علم نور ہے۔ منشائے انکشاف ہے۔ جس کا ادراک عام نہیں اس کو انکشاف بھی کامل نہیں۔

اے طالب! کہیں تم کو مخلوقات کا باہمی تفاضل حجاب روے وحدت نہ ہو جائے اور تم کہہ اٹھو کہ یہ قول ہر گز درست نہیں کہ خلق، ذات حق کی عین ہے، اس سے وابستہ ہے۔ اس لیے کہ میں نے تم کو بتا دیا ہے کہ اسماے الٰہیہ میں بھی تفاضل ہے تو کیا تم کو اس میں بھی شک ہے کہ اسماے الٰہیہ میں عین ذات حق اور ان اسما کا مدلول و مسمیٰ اللہ کے سوا کوئی اور نہیں۔

لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے نام کو اللہ کے نام پر کیوں کر مقدم کرتے! جیسے کہ بعض مفسرین کا خیال ہے، اور ابتداے خط إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ سے، اور اس کے بعد وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّـهِ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ سمجھتے ہیں، حالاں کہ حضرت سلیمانؑ نے حق تعالیٰ کی رحمت امتنانی سے وجود حاصل کیا ہے۔ ضروری ہے کہ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ کو اپنے نام سے مقدم کرتے، تاکہ مرحوم کی نسبت راحم سے {یعنی سلیمانؑ کی نسبت رحمٰن و رحیم سے} صحیح ہو۔ ان مفسرین کا قول علم حقائق و حکمت کے برعکس ہے کیوں کہ حکمت کا اقتضا ہے تقدیم ما حقہ التقدیم اور تاخیر ما حق التاخیر {یعنی} مناسب ترتیب۔۔۔ جس کو پہلے رکھنا ہے اس کو پہلے ہی رکھنا چاہیے اور جس کو بعد رکھنا ہے اس کو بعد ہی رکھنا چاہیے۔ تقدیم و تاخیر بلحاظ استحقاق و مرتبہ ہے۔ ہر شئے کو اس کے محل پر رکھنا ہی تو حکمت ہے۔

بی بی بلقیس کی حکمت اور ان کے علوے علم (یا بڑے پن) سے یہ بھی ہے کہ انھوں نے اُس شخص کا نام ظاہر نہیں کیا جس نے سلیمانؑ کا خط پہنچایا تھا۔ یہ اس لیے کہ کیا کہ اپنے متعلقین کو معلوم کرائیں کہ ان کو ایسے امور سے بھی تعلق ہے جن کے طریقوں سے وہ واقف نہیں۔ اور یہ بھی امور سلطنت میں تعلیم و تدبیر الٰہی سے ہے۔ کیوں کہ جب بادشاہ کی طرف پہنچنے والے اخبار کا علم رعایا کو نہیں ہوتا اور لوگ یہ جانتے ہیں کہ ان کے بادشاہ کو خفیہ اطلاعات پہنچ جاتی ہیں تو حفظ و ضبطِ ملک اچھی طرح ہوتا ہے۔ رعایاے سلطنت ڈرنے لگتی ہے اور لوگ کوئی کام ایسا نہیں کرتے کہ اگر اس کی اطلاع سلطان کو پہنچ جائے تو ہدفِ بلا ہو جائیں۔ اسی لیے بادشاہ خفیہ پولیس کو پوشیدہ جواسیس (یعنی خبر دینے والوں) کو لگائے رکھتے ہیں۔ اگر رعایا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کو فلاں ذریعے سے اطلاعات پہنچتی ہیں تو اس سے ساز باز کر لیتے ہیں۔ رشوت دیتے ہیں، خوشامد کرتے ہیں تاکہ جو چاہیں کر سکیں اور شاہ کو اطلاع نہ ہو۔

بلقیس نے کہا، میرے پاس خط لایا گیا ہے۔ لانے والے کا نام نہیں بتایا۔ یہ ان کی سیاست تھی جس سے رعایا اور مدبرینِ خاص بھی پُر حذر (یعنی دُور دُور) رہتے تھے۔ اس حسنِ سیاست کی وجہ سے بلقیس کو دوسروں پر تقدیم و فضیلت تھی۔

انسانی عالم اور جنّی عالم میں کون زیادہ ہے، کون قوی تر ہے۔۔؟ اس کے تصفیے کے لیے سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیا اور عفریت جنّی کے اقوال اور ان کے قوتِ تصرف پر غور کرو۔ حضرت سلیمانؑ نے استفسار فرمایا تھا کہ تختِ بلقیس کو کون جلد لاتا ہے۔ عفریت نے کہا "آپ کے اسی مقام سے برخاست فرمانے سے پہلے تخت بلقیس لاتا ہوں"۔ آصف بن برخیا نے کہا "چشم زدن میں تخت بلقیس کو لاتا ہوں"۔ اب غور کیجیے کہ عالم صنف انسانی اور عالم صنف جنّی میں کون افضل ہے اور کون اسرارِ تصرفات اور خواصِ اشیا سے زیادہ واقف ہے۔ ظاہر ہے کہ پلک جھپکنے اور شعاعِ نظر کا جاکر واپس آنے کا وقت بہت کم ہے، بہ نسبت مجلسِ سلیمانی کے برخاست ہونے کے۔ اس لیے کہ نور نظر کی حرکت، شئے مبصّر (یعنی دیکھی جانے والی چیز) تک تیز تر ہے، بہ نسبت حرکتِ جسم کے اس شئے کی طرف، جس کی طرف حرکت کرنا چاہتا ہے۔ دیکھو! نظر کے نکلنے، مبصّر تک پہنچنے، پھر واپس آنے کا زمانہ ایک ہی ہے، باوجود یہ کہ ناظر و منظور میں بہت بڑی مسافت ہے (بہت زیادہ فاصلہ ہے)۔ ادھر نظر نکلی اور کواکب و ثوابت (یعنی ستاروں) تک جا پہنچی اور عدم ادراک کا زمانہ اور رجوع کا زمانہ ایک ہے۔ (جب کہ) سلیمانؑ کے اپنے مقام سے برخاست فرمانے کا زمانہ اتنا نہیں ہے نہ اس میں اتنی سرعت ہے کہ جتنی نظر میں ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ آصف بن برخیا عمل و تصرف میں جنّی سے اتم و اکمل تھے۔ آصف کے کہنے اور تخت کے لانے کا زمانہ گویا ایک ہی تھا۔

آصف بن برخیا کے کہنے ہی کے زمانے میں (یعنی بات کرنے کے دوران ہی) سلیمانؑ نے تختِ بلقیس کو اپنے پاس موجود حاضر دیکھا، تاکہ کہیں حضرت سلیمانؑ کو یہ خیال نہ پیدا ہو کہ انھوں نے قوتِ کشف سے تختِ بلقیس کو دیکھا ہے۔ اسی لیے قرآن شریف (کی سورۃ النمل: ۴۰) میں مُسْتَقِرًّا عِندَهُ آیا ہے، یعنی تختِ بلقیس، سلیمانؑ کے پاس حاضر و قرار پذیر تھا۔ آصف کا تخت کو حاضر کرنا نظر تحقیق میں ہمارے پاس اتحادِ زماں کے ساتھ نہ تھا بلکہ اعدام و ایجاد (یعنی) سبا سے معدوم کرنا اور دربار سلیمانی میں موجود کرنا تھا۔ اس کو تجددِ امثال کہتے ہیں۔ (اس لیے کہ) ہر آن، ہر شئے قہر احدیت سے معدوم ہوتی ہے اور پھر اس کو رحمتِ امتنانی موجود کرتی ہے۔ مگر عارفین کے سوا اس کو کوئی محسوس نہیں کرتا۔۔ دیکھو! قرآن شریف میں ہے، بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ، {یعنی} ان کو التباس اور دھوکا ہو گیا ہے تازہ پیدائش و خلقِ جدید سے کہ وہی اگلی شئے ہے، (ق:۱۵)۔ ان پر کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرتا کہ جس شئے کو دیکھ رہے ہوں، نہ دیکھا ہو۔

جب معلوم ہو گیا کہ ہر شئے میں تجددِ امثال ہے، اعدام و ایجاد ہے۔ نیستی کے ساتھ ہستی لگی ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک شئے موجود ہو کر حق قیوم کی طرف دائمی محتاج نہ رہی ہو، بلکہ ہر شئے کو ہر آن امدادِ وجود

ہوتی ہے اور قیوم جل جلالہٗ کی طرف دائمی احتیاج رہتی ہے۔ بہر حال تختِ بلقیس کا ملک سبا میں نیست و نابود ہونا اور حضرت سلیمانؑ کے حضور میں ہست و موجود ہونا یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ تھے۔ یہ ہر دم میں، ہر سانس میں تجدیدِ خلق اور تازہ امدادِ وجود کا نتیجہ ہے۔ اس کا علم ہر شخص کو نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان خود کو (بھی) نہیں سمجھتا کہ وہ ہر آن لایکون اور پھر یکون ہوتا ہے۔ معدوم ہوتا ہے، موجود ہوتا ہے۔ یہاں ثمّ(یعنی) "اور پھر" کو مہلت (یعنی وقفے) کے لیے نہ سمجھو بلکہ یہاں ثمّ{اور پھر} کا لفظ صرف تقدّم بالعلیّہ (یعنی سبب میں اولیت) کا مقتضی ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ اول ہاتھ گھومتا ہے اور پھر چابی گھومتی ہے۔ یہاں حرکتِ ید (ہاتھ کی حرکت) کو حرکتِ مفتاح (چابی کی حرکت) پر تقدیم بالعلیّہ (علّت کی فوقیت) ہے، (مگر) ایسا ہر گز نہیں (ہے) کہ ہاتھ گھومنے کے زمانے کے بعد چابی گھومتی ہے۔ عربی زبان میں بعض خاص خاص مقام میں ثمّ بلا مہلت بھی مستعمل ہوتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے، کھز الرّدینی ثم اضطرب، (یعنی) نیزۂ ردینی کا ہلانا اور پھر اس کا ہل جانا۔ ظاہر ہے کہ نیزے کے ہلانے کا زمانہ اور اس کے ہلنے کا زمانہ یہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ یہاں ثمّ{اور پھر} مہلت کا مقتضی نہیں۔

اسی طرح ہر دم، ہر آن تجددِ خلق اور امداد وجودِ تازہ مقتضیِ مہلت و تراخی نہیں۔ زمانۂ عدم اور زمانۂ وجود مثل معاً ہیں (بالکل ساتھ ساتھ ہیں)۔ جس طرح اشاعرہ (یا اشعری فرقہ) کے پاس اعراض وصفات اور غیر مستقل موجودات کی طرف دائمی محتاج ہیں اور ہر آن، ہر لحظہ تجدد امثال اعراض پر ہو رہا ہے۔ اسی طرح صرف ذاتِ حق موجودِ مستقل ہے۔ اس کے سوائے جتنے موجودات ہیں سب غیر مستقل ہیں۔ دائمی طور پر محتاج الی الحق ہیں۔ ہر آن ہر لحظہ متجدد ہیں۔

تجددِ امثال کا مسئلہ جو حصول تخت بلقیس میں چھیڑا گیا ہے مشکل ترین مسائل سے ہے۔ مگر اس قصّے میں ابھی جو میں نے بیان کیا اس کے سمجھنے والے کے لیے کچھ دشوار نہیں۔ آصف بن برخیا کی فضیلت و بزرگی یہی ہے کہ وہ امدادِ وجود، وہ تجدیدِ تخت بلقیس (اور) وہ تجلّیِ الٰہی جو تخت بلقیس پر ملک سبا میں ہو رہی تھی اس کو سلیمانؑ کے سامنے مجلس میں کھینچ لیا، اور تخت موجود ہو گیا۔ پس حقیقت میں تخت نے نہ قطعِ مسافت کی نہ اس کے لیے زمین لپیٹ دی گئی اور نہ دیواروں کو توڑا پھوڑا۔ اس مسئلے کو وہی سمجھتا ہے جو تجددِ امثال کو جانتا ہے، جو تجلّیِ الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

یہ تصرف، بعض اصحابِ سلیمانؑ سے ظاہر ہوا تا کہ اس کا اثر بلقیس اور ان کے ہمراہیوں کے دلوں پر عظمت و مرتبت سلیمانؑ کے لیے پڑے۔ اس تصرف کا سبب یہ ہے کہ سلیمانؑ، داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ و ہبہ تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَوَهَبْنَا لِدَاوُودَ سُلَيْمَانَ، (یعنی) ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا۔ (ص:۳۰)۔

ہبہ کیا ہے۔ واہب کا موہوب لہٗ کو بطور انعام دینا، نہ بطور جزائے عمل (ہے) اور نہ (ہی) بر بنائے استحقاق۔ سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی نعمتِ سابقہ و حجتِ بالغہ اور اعدا (یعنی دشمنوں) کے لیے سر شکن ضرب ہیں۔

اب سلیمان علیہ السلام کے علم پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ، (یعنی) ہم نے اس مسئلے کو سلیمان کو سمجھا دیا، (الانبیاء:۷۹)۔ واقعہ یہ ہے کہ (ایک بار کوئی) بکریوں کا ریوڑ رات کے وقت کسی کے کھیت میں جا گھسا اور کھا کر اور کھندل کر (یعنی دوڑ بھاگ کر تمام) کھیت کو تباہ کر دیا۔ کھیت والے نے داؤدؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر بکریوں کے مالک پر دعویٰ دائر کر دیا۔ جتنے کی بکریاں تھیں اتنے ہی کا کھیت کا نقصان ہوا تھا۔ چناں چہ داؤدؑ نے بکریاں کھیت والے کو دلوا دیں۔ مدعیٰ علیہ جانے لگے، تو راستے میں حضرت سلیمانؑ مل گئے۔ انھوں نے کہا کہ حکم یہ ہونا چاہیے تھا کہ جب تک کھیتی درست نہ ہو اور اپنی حالت پر نہ آجائے اس وقت تک بکریوں کا مالک کھیت والے کی خدمت کرے، یعنی اس کی کھیتی کے کام میں لگا رہے، اور اس وقت تک بکریوں کا دودھ اور ان کی اون (بھی) کھیت والا لیتا رہے۔ اس کے بعد بکریاں، بکریوں والے کو واپس۔۔۔ بہر حال اس مسئلۂ خاص میں خدائے تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی رائے کے خلاف، سلیمانؑ کو صحیح فیصلے کا الہام فرمایا تھا۔ باوجود یہ کہ اللہ تعالیٰ (سورۃ الانبیاء کی اسی آیت ۷۹ میں آگے) فرماتا ہے، وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا، (یعنی) ہم نے {داؤد اور سلیمان میں سے} ہر ایک کو حکومت اور علم دونوں دیے تھے۔ بات یہ ہے کہ داؤدؑ کا علم عام طور سے تھا۔ اور سلیمانؑ کا علم عام طور سے بھی تھا اور اس مسئلۂ خاص میں خاص طور سے تھا۔ الہامی تھا۔ اللہ ہی کا علم تھا۔ اور فیصلۂ سلیمانؑ علم و مرضیِ الٰہی کے مطابق تھا۔ گویا اُس وقت اللہ تعالیٰ ہی حاکم بلا واسطہ تھا۔ اور حضرت سلیمانؑ مقام صدق وصفا میں ترجمانِ حق تھے۔

مجتہد (یعنی حق بات کے لیے کوشش کرنے والے) کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ مصیب: صواب و مقصد الٰہی کے مطابق، حق کے موافق۔

۲۔ مخطی: خطا کرنے والا۔ اس نے کوشش تو کی مگر حق و صواب (یعنی سچ اور درست) کو نہ پہنچ سکا۔

مصیب نے چوں کہ اجتہاد و کوشش کی اور وہ صواب و حق کو پہنچا۔ اس نے ایسے ہی کیا جیسے کہ حق تعالیٰ خود یا بتوسط رسول اور وحی کے بیان کرتا، (لہٰذا وہ مستحقِ اجر ہو گا)۔ اور مخطی، نفس الامر میں مقصد و حکم الٰہی کو جو عند اللہ متعین تھا نہ پہنچا تو اس کو اس کے اجتہاد کا ثواب مل جائے گا، اور باوجود خطا کے اس کا حکم، حکم شرعی و علم سمجھا جائے گا۔

دیکھو! اس امّتِ محمدیہ کو مصیب کی صورت میں رتبۂ سلیمانی دیا گیا۔ اور خطا کی صورت میں بھی رتبۂ داؤدی عطا کیا گیا۔۔۔ ماشاء اللہ امت محمدیؐ کی کیا شان ہے۔۔ کیا فضیلت ہے۔

جب بلقیس نے اپنے تخت کو مجلس سلیمانی میں دیکھا باوجود یہ کہ وہ سمجھتی تھیں کہ اتنی بڑی مسافت کے لیے اتنی کم مدت میں منتقل کرنا تقریباً محال ہے تو،قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ،(یعنی){بلقیس نے} کہا کہ گویا کہ یہ تخت وہی ہے،(النمل:۴۲)۔ بلقیس نے تجددِ امثال کے مسئلے کی تصدیق کی جس کو ابھی ہم نے بیان کیا اور وہ تختِ بلقیس ہی تھا۔ اور یہ ایسا ہی سچ ہے جیسے کہ تم جو زمانۂ ماضی میں تھے، زمانۂ تجدید میں بھی ہو۔

پھر کمال علم، سلیمانؑ سے تنبیہ بھی ہے جس کو انھوں نے صریح یعنی محل کے ذکر میں کیا،قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ،(یعنی)پھر {بلقیس سے} کہا گیا کہ محل میں داخل ہو،(النمل:۴۴)۔ وہ شیش محل تھا۔ ہموار تھا۔ اس میں نشیب و فراز نہ تھا۔ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً (وَكَشَفَتْ عَن سَاقَيْهَا)،(یعنی)جب{بلقیس نے}اس گھر کو دیکھا تو پانی سمجھا، پھر اپنے پائنچے پنڈلیوں سے چڑھا لیے{کہ کہیں پانی ان کے کپڑوں کو نہ لگ جائے} (النمل:۴۴)۔ حضرت سلیمانؑ نے اُس سے اس امر پر تنبیہ کی۔ ان کا تخت جس کو انھوں نے دیکھا اسی قبیل کا ہے، کہ بظاہر اگلا تخت ہے مگر ہے اس کا مثل۔ اس کی شبیہ۔ جیسے شیش محل پانی کا شبیہ ہے۔ یہ تنبیہ نہایت حق ہے۔ سلیمانؑ نے بلقیس کے "كَأَنَّهُ هُوَ" کہنے کی تائید کی۔ سلیمانؑ کے حسنِ توجہ سے مسئلۂ تجددِ امثال کا انکشاف ہو گیا۔ انھوں نے ذاتِ حق کو، كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ،[(یعنی)وہ ہر آن نئی شان میں ہے،(الرحمٰن:۲۹)] میں دیکھا۔ اور اس وقت وہ کہہ اٹھیں،رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّـهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ،(یعنی)اے میرے رب تجھے نہ جان کر میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اب خود سلیمانؑ کی طرح اللہ ربّ العالمین کے حوالے کر دیا،(النمل:۴۴)، اور اس کی اطاعت اختیار کر لی۔ دیکھو! بی بی بلقیس نے سلیمانؑ کی اطاعت کا نام نہیں لیا بلکہ وہ ربّ العالمین کی مطیع و منقاد ہوئیں۔ کیوں کہ حضرت سلیمانؑ بھی عالمین میں داخل ہیں۔ انھوں نے اپنے انقیاد و اطاعت کو کسی ایک شان سے خاص (بھی) نہیں کیا۔ جس طرح انبیا و رسل کسی شانِ خاص سے اپنے اعتقاد کو خاص نہیں کرتے۔ اس لیے بلقیس نے ربّ العالمین کہا۔ یہ عام لفظ ہے۔ بر خلاف فرعون کے (ساحروں کے) کہ انہوں نے کہا،آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ،[(یعنی)ہم ربّ موسیٰ و ہارون پر ایمان لاتے ہیں، (طٰہٰ:۷۰)]۔ اگرچہ ایک وجہ سے فرعون (کے ساحروں) کا یہ کہنا بھی اطاعتِ بلقیس سے مشابہ ہے۔ کیوں کہ موسیٰؑ و ہارونؑ بھی ربّ العالمین پر اعتقاد رکھتے تھے۔ مگر بلقیس کے اعتقاد کی قوت فرعون کے (ساحروں کے) ایسے کہنے میں کہاں۔ بلقیس فرعون سے زیادہ اطاعتِ الٰہی میں دانا اور صاحبِ بصیرت تھیں۔ فرعون موقع اور وقت کا تابع تھا، دیکھا دیکھی کہتا تھا۔ اس نے کہا،[آمَنتُ (أَنَّهُ لَا إِلَـٰهَ إِلَّا) الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ،(یعنی)میں ایمان لاتا ہوں (کہ کوئی معبود نہیں مگر) جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اس پر میں ایمان لاتا ہوں،(یونس:۹۰)]۔ فرعون نے بنی اسرائیل

کے رب کی تخصیص کی۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ساحروں کو ایمان لاتے وقت کہتے دیکھا، [آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ، (یعنی) مان لیا ہم نے ھارون و موسیٰ کے رب کو، (طٰہٰ:۷۰)]۔ پس اسلام بلقیس، مثل اسلام سلیمانؑ تھا۔ اس لیے کہ انھوں نے، (أَسْلَمْتُ) مَعَ سُلَيْمَانَ، [میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اطاعت قبول کی] کہا، (النمل:۴۴)، اور ان کے ہمراہ ہو گئیں۔ سلیمانؑ جس عقیدے پر سے گزرتے بلقیس بھی وہی عقیدہ رکھ کر ان کے ساتھ گزرتیں۔

ہم اس صراط مستقیم پر ہیں جس پر ربّ تعالیٰ ہے۔ کیوں کہ ہمارے موے پیشانی اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے ہم کو بھی گھسیٹتا لے جا رہا ہے۔ لہٰذا محال ہے کہ ہم اس سے جدا ہوں۔ ہم ضمناً اس کے ساتھ ہیں اور وہ صریحاً ہمارے ساتھ ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے، وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ، (یعنی) وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہاں رہو، (الحدید:۴)۔ اس لیے کہ بالعرض کے ساتھ بالذّات لگا ہوا ہے۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہیں کیوں کہ وہ ہمارے موے پیشانی پکڑے ہوئے ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب خارج میں حق کے سوا کوئی نہیں تو حق تعالیٰ جس رستے پر ہم کو لے جائے وہ حقیقتاً اپنے ساتھ آپ ہے، اور راہ مستقیم، راہ ربّ تعالیٰ ہے۔

بلقیس نے حضرت سلیمانؑ سے بھی علم حاصل کیا تھا کیوں کہ انھوں نے کہا، لِلَّـهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (النمل:۴۴)۔ ایک عالم کو لیا (اور) ایک کو چھوڑا، ایسا ہرگز نہیں کیا۔ وہ تسخیر جو سلیمانؑ سے خاص ہے اور جس کی وجہ سے ان کو ان کے غیر پر فضیلت دی گئی ہے اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایسی حکومت و بادشاہت عطا کی کہ ان کے بعد کسی کو سزاوار نہ ہو۔ وہ تسخیر یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا اور چیز ہو گئی۔ نہ ہمت کی ضرورت، نہ جمعیتِ ارادہ کی حاجت۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ، [(یعنی) پس ہم نے ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ ان کے حکم پر وہ چلتی تھی، (ص:۳۶)]۔ وہ مطلق تسخیر نہ تھی کیوں کہ مطلق تسخیر تو عام بنی آدم کے لیے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ بلا تخصیص ہم سب کے حق میں فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ، (یعنی) {اللہ تعالیٰ نے} مسخر کر دیا تھا تمھارے لیے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے {تمام و کمال}، (الجاثیہ:۱۳)۔ قرآن شریف میں جابجا تسخیر ریاح و نجوم وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ یہ سب ہمارے امر و حکم سے نہیں ہوتا بلکہ امر الٰہیٰ سے ہوتا ہے۔ پس جو تسخیر سلیمانؑ سے خاص ہے اس میں ان کا صرف کہہ دینا اور امر کر دینا کافی ہوتا تھا۔ تم کو معلوم ہے کہ اجسام و موجودات یہ سب ہمت ہاے نفس، عزم قلب، جمعیت خاطر، وِل پاور (will power) سے متاثر و منفعل ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ارواح فلکیہ، خواص امور طبیعیہ، اسماے الٰہیہ، آیات کلام اللہ اور اقوال اہل اللہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ نہ معجزات کی قسم سے ہیں نہ کرامات کی۔ ہم نے اہل ریاضت سے اس قسم کے بہت امور دیکھے ہیں۔ سلیمانؑ بغیر ہمت و جمعیت کے صرف حکم دے دیتے اور کام ہو جاتا۔

اللہ ہم کو اور تم کو اپنی روح سے تائید دے۔ ایسی عطا کسی بندے کو عطا کی جاتی ہے تو آخرت کے حصے اور ملک سے کچھ نقصان و کمی نہیں ہوتی۔ اس سے بازپرس بھی نہیں ہوتی۔ باوجود یہ کہ سلیمانؑ نے ربّ العالمین سے دعا کی تھی اور ذوقِ طریق معرفت کا اقتضا تو یہ ہے کہ دوسروں کو آخرت میں جو ملنے والا ہے وہ حضرت سلیمانؑ کو جلد یہاں مل گیا ہو، اور اس پر محاسبہ بھی ہو، اگر آخرت میں اللہ چاہے۔ مگر اللہ تعالیٰ سلیمانؑ سے (سورۃ ص کی آیت ۳۹ میں) فرماتا ہے، ھَـٰذَا عَطَاؤُنَا، (یعنی) یہ ہماری داد ہے، بخشش ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم کو یا تمھارے غیر کو، فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ، (یعنی) چاہو کسی کو دو چاہو نہ دو، کوئی حساب نہیں۔

اس سے ذوقِ طریق بتا رہا ہے کہ یہ سوال بھی امر رب سے تھا۔ طلب جب امر الٰہی کی اتباع میں ہوتی ہے تو طالب کو اس کی طلب میں اجر تام اور ثوابِ کامل ملتا ہے۔ باری تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے حاجتِ مطلوبہ کو عطا کرے، چاہے عطا نہ کرے۔ بندے نے تو جو حکم اس کو دیا گیا تھا اس کو پورا کیا۔ پھر بھی ذاتی خواہش سے اصرار اور ہٹ نہ ہو۔ اگر کوئی طلب، ذاتی خواہش اور بغیر امر رب کے ہو تو ضرور اس سے محاسبہ ہو گا۔ یہ قاعدہ تمام دعاؤں میں چلتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے، وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا، (یعنی) {یا محمد} تم کہو، اے میرے پروردگار! مجھے علم میں بڑھا اور ترقی دے، (طٰہٰ:۱۱۴)۔ پس آپؐ حسب امر رب تعالیٰ زیادتِ علم کی دعا کرتے۔ یہاں تک کہ عالم شہادت، عالم بیداری میں بھی سامنے دودھ آتا تو اس کی تاویل، علم (سے) کرتے۔ جیسے کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی خدمت میں دودھ کا ایک پیالا پیش کیا گیا، آپ نے اس کو نوش فرمایا اور اس کا بقیہ عمر بن الخطابؓ کو دیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس کی تعبیر آپ نے کیا دی، تو فرمایا "علم"۔

اسی طرح جب آپ کو معراج ہوئی تو خدمتِ مبارک میں دو پیالے پیش کیے گئے۔ ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب۔ آپ نے دودھ پی لیا۔ فرشتے نے کہا، آپ نے فطرت کے مطابق کام کیا۔ یعنی اسلام اور علم صحیح کو اختیار کیا۔ اللہ آپ کی وجہ سے آپ کی امت کو بھی اس کی توفیق عطا کرے۔ بہر حال دودھ جب نظر آجائے تو وہ علم کی صورت ہے۔ علم ہی دودھ کی صورت میں متمثل ہوا ہے۔

جبرئیلؑ پورے انسان کی صورت میں بی بی مریم کے سامنے متمثل ہوئے تھے، غور کرو، دنیا تمام عین ثابتہ معلوم الٰہی و تجلیات اسمائے الٰہیہ کی نمائش ہے۔ حضرت رسول کریمؐ فرماتے ہیں (کہ) لوگ سو رہے ہیں، جب مریں گے تو بیدار ہوں گے۔ آپؐ تنبیہ فرماتے کہ انسان جو کچھ حیاتِ دنیا میں دیکھتا ہے وہ، سونے والے کے سامنے، بمنزلہ خواب و خیال ہے۔ لہٰذا اس کی تاویل ضروری ہے۔ اس کی حقیقت کی طرف راہ نکال لینی لابُد ہے، (لازمی ہے)۔

یہ بالکل حق ہے کہ دنیا خواب و خیال ہے۔ جو اس مسئلے کو سمجھ جائے وہ رازہائے حقیقت حاصل کرے گا۔ زندگی خواب ہے۔ موت بیداری ہے۔ اور آدمی ان دونوں کے درمیان چلتا پھرتا خیال ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریف یہ تھی کہ جب آپ کے سامنے دودھ پیش کیا جاتا تو دعا کرتے، اللّٰھم بارک لنا فیہ وزدنا منہ، (یعنی) یا اللہ! تو اس میں ہمارے لیے برکت دے، اور یہ ہم کو اور دے۔ آپؐ دودھ کو علم کی صورت اور اس کا تمثل دیکھتے تھے۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب زیادتِ علم کا حکم دیا گیا تھا۔ جب آپؐ کے سامنے دودھ کے سوا کوئی اور شئے پیش کی جاتی تو دعا کرتے، یا اللہ! ہم کو اس میں برکت دے اور اس سے زیادہ اچھا کھلا۔

غرض یہ کہ اللہ نے جو کچھ دیا (اگر) امر الٰہی کی اتباع میں طلب کیا گیا ہے تو اللہ اس کے متعلق آخرت میں محاسبہ نہ فرمائے گا۔ اور اگر بغیر امر الٰہی کے سوال کیا ہے تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ چاہے اس کا محاسبہ کرے یا نہ کرے۔ مجھے اللہ سے امید ہے کہ بطور خاص طلب زیادت علم میں محاسبہ نہ فرمائے گا۔ کیوں کہ اپنے نبی کو حکم فرمایا ہے کہ طلب زیادت علم کے لیے دعا کریں۔ حضورؐ کو حکم دینا امت کو حکم دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، بے شک تمھارے لیے رسول اللہ میں اسوۂ حسنہ ہے، بہتر نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام سمجھنے والے کے لیے حضورؐ کی پیروی سے بہتر کونسی اور کس کی پیروی ہوگی۔

اے طالبِ عرفان! اگر ہم تم کو مرتبہ و مقام سلیمان علیہ السلام سے پوری اطلاع دیں تو تم گھبرا اٹھو گے۔ کیوں کہ اکثر لوگ حالت و مرتبت سلیمانؑ سے واقف نہیں۔ ان کے خیالات حضرت سلیمانؑ کے متعلق درست نہیں۔

Siddiqui Publications

هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ

الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ

الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ

Siddiqui Publications